انیسویں صدی کے اواخر میں مغربی رومانوی نظم کے اُردو تراجم کا فروغ
(نوآبادیاتی تناظر میں)

احتشام علی

ABSTRACT:

Modern Urdu Poem origins of which flourished in the influence of ***Anjuman-e-Punjab***, a colonial institution,kept absorbing every ebb and flow of the Colonial period for more or less one century.In this article an effort has been made to study the translations of western poems and their flourishment towards the end of Nineteenth Century in Colonial Context.

نوآبادیاتی برِصغیر میں جدید اردو نظم کو قلبِ ماہیت کے عمل سے گزارنے کا باقاعدہ آغاز ۱۸۷۴ء میں انجمنِ پنجاب کے مشاعروں سے ہوتا ہے،لیکن مغربی نظموں کو اردو کے قالب میں ڈھالنے کا سلسلہ اُسی وقت شروع ہو گیا تھا جب مغربی استعمار کاروں نے تجارت کے بہانے مقامی حکمرانوں سے تہذیبی و ثقافتی ارتباط بڑھانے کا آغاز کیا تھا۔محققین کے مطابق ۱۷۹۲ء میں نواب سعادت علی خان کی فرمائش پر انشا اللہ خان انؔشا نے ایک انگریزی شاعر جان کارش کی نظم کو فارسی سے اردو میں ترجمہ کیا(۱)،اغلب ہے کہ یہ انگریزی شاعری کا اردو میں پہلا منظوم ترجمہ تھا۔۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے بعد استعمارکاروں نے اپنی تہذیبی و ثقافتی برتری کو ثابت کرنے کے لیے مقامی باشندوں کے سامنے انگریزی ادب کو ایک کینن کے طور پر متعارف کروایا تھا۔اسی لیے مغربی شاعری کے اردو تراجم کا ایک مقصد مشرقی شعریات کو ازکار رفتہ قرار دیتے ہوئے ،مغربی شعریات کو اُس کے متبادل کے طور پر پیش کرنا تھا۔نوآبادیاتی اجارے کے ابتدائی دور میں مغربی تہذیب ، زبان اور ثقافت کو فروغ دے کر ،مقامی باشندوں کے ذہن میں مقامی کلچر سے متعلق احساسِ کمتری کو انگیخت کیا جارہا تھا۔انگریزی زبان کو تعلیمی اور سرکاری حیثیت دلانے میں ان تراجم کا ایک کلیدی کردار یہ بھی تھا کہ ان تراجم کے ذریعے ہی استعمارکاروں نے شعری متن پر اپنا تصرف قائم کرنے کی بھرپور کوشش کی تھی ،تے جسوینی نرینجانا کے الفاظ میں :

''استعمار زدہ لوگوں کی جانب سے انگریزی تعلیم کی مانگ ، اپنی پسماندگی کو تسلیم کرنے یا کسی سیاسی مصلحت کی عکاس نہیں تھی ، بلکہ یہ ایک ایسی پیچیدہ ضرورت تھی جسے استعمار کاروں نے تاریخی حقائق کی مدد سے پروان چڑھایا تھا اور اس ضرورت کو (مغربی) تراجم کے ذریعے پیدا کر کے، برقرار رکھا گیا تھا۔'' (۲)

یہی وجہ ہے کہ ۱۸۶۴ء میں قلق میرٹھی کی جواہرِ منظوم (۳) کی اشاعت سرکاری مدارس کے انگریزی نصابات کو پیش نظر رکھ کر کی گئی تھی۔ جواہرِ منظوم انگریزی شاعری کے اردو تراجم کا پہلا مجموعہ تھا، بعد میں اسی مجموعے کے اگلے حصوں کے طور پر بانکے لال بہاری نے ۱۸۶۹ء اور رحیم اللہ نے ۱۸۷۲ء میں بیس بیس انگریزی نظموں کے ترجمے کیے۔ پنڈت بانکے لال بہاری اپنے تراجم کے مجموعے گوہرِ شب تاب کے دیباچے میں، اِن تراجم کے اصل محرک کو نشان زد کرتے ہوئے، انھیں انگریزی زبان کی برتری کے احساس کا زائیدہ قرار دیتے ہیں۔ گویا استعمار کار اپنے مخصوص نو آبادیاتی کلامیوں کے ذریعے مقامی باشندوں کو یہ باور کروانے میں کامیاب ہوگئے تھے کہ مقامی ادب ، تہذیب اور ثقافت زمانے کے بدلتے ہوئے معیاروں پر کسی صورت بھی پورے نہیں اتر رہے۔ جواہرِ منظوم میں شامل مختلف انگریزی نظمیں استعمار کاروں کی اُن پیچیدہ نو آبادیاتی ضرورتوں کو سامنے لاتی ہیں جن کے تحت شعری متن کو ایک مخصوص رومانوی قالب میں ڈھالا جاتا ہے۔ جواہرِ منظوم میں شامل نظموں کے کے عنوانات ملاحظہ ہوں جن سے یہ سمجھنے میں آسانی رہے گی کہ مغربی استعمار کار اردو نظم میں کس قسم کے موضوعات کو رواج دینا چاہتے تھے۔

'اوصاف اخلاقِ شتر'، 'بیانِ کرمک'، 'حکایتِ پسرِ ناخدا'، 'بیانِ جنت'، 'میرا باپ کشتی بان ہے'، 'داستان اندھے لڑکے کی'، 'داستان شاہ کینیوٹ'، 'قصّہ ولیم ٹیل ساکن سوئٹزرلینڈ'، 'خواہش طفل'، 'عرضی موش محبوس'، 'لڑکپن کی پہلی مصیبت'، 'دربیان تمیزحق و باطل'؛ 'ذکر ابابیل بدیسی کا'، 'سادگی طبعیت کی خواہش' یہ درج بالا تمام نظمیں ایک ایسے رومانی زاویہ نظر سے منتخب کی گئی تھیں، جس کا واحد مقصد مقامی تخلیق کاروں کے سوچنے، سمجھنے اور لکھنے کی صلاحیتوں کو ایک مخصوص ذہنی سانچے میں منقلب کرنا تھا۔ یہ نظمیں مغربی استعمارکاروں کی طرف سے شعوری طور پر متعارف کرائے گئے، اُس ادبی تصور کو سامنے لاتی ہیں جس میں تخلیق کار خارجی مظاہر سے گریز کرتے ہوئے محض داخلی دنیا کا اسیر ہو کر رہ جاتا ہے۔ اپنے گرد و پیش میں کھیلے جانے والے جبر و استبداد کے کھیل میں اپنا کوئی مؤثر اور فعال کردار ادا کرنے کی بجائے اُس کی حیثیت ایک ایسے' معمول' کی سی ہو جاتی ہے جسے' عامل' اپنی مرضی کے مطابق ڈھالنے کی پوری صلاحیت رکھتا ہے۔ یہاں یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ نو آبادیاتی عہد میں استعمار کار مقامی باشندوں کے لیے جس ادبی متن کا انتخاب کرتا ہے اُس میں رومانوی ادب کو زیادہ اہمیت تفویض کی جاتی ہے۔ برطانوی نقاد، لیسلزابرکرومبی (Lascelles Abercrombie) واقعیت سے گریز کو رومانیت کی بنیادی صفت قرار دیتے ہوئے اس کی تعریف ان الفاظ میں کرتا ہے ''نفسِ انسانی باہر کی دنیا سے رسم و راہ گھٹا کر اپنے اندر کی چیزوں میں منہمک ہو جاتا ہے۔ رومانیت خارجی تجربوں سے روگردانی اور اندرونی تجربوں میں انہماک کا نام ہے۔'' (۴)

نوآبادیاتی عہد کے سیّاق میں اس متناقض صورتِ حال کو پیشِ نظر رکھنا چاہیے کہ بظاہر تو استعمار کار، مقامی باشندوں کے ہاں تعقل اور حقیقت پسندی کے فقدان کو ہدفِ تنقید بناتے ہیں اور اِس کمی کو دور کرنے کے لیے، ایک ایسے معاشرے کی تشکیل پر زور دیا جاتا ہے جس کی بنیادیں نئی آگہی اور تعقل پر استوار ہوں،لیکن استعمار زدہ باشندوں کے لیے ادبی انتخاب کا مرحلہ آتے ہی تعقل اور حقیقت پسندی کی جگہ رومانوی اور تخیلاتی ادب کو مل جاتی ہے ۔وہ مغربی شعرا جنھیں شاملِ نصاب کر کے مذکورہ عہد میں اُردو شاعری کے عوارض کا علاج کرنے کی کوشش کی جارہی تھی اپنی اصل نہاد میں رومانوی تھے اور یورپی شاعری کو کینن بنا کر شروع کیے گئے جدید شاعری کے منصوبے میں ان شاعروں کی رومانوی نظموں کے تراجم کو ایک ماڈل کی حیثیت حاصل تھی ۔فرانز فینن نوآبادیاتی اجارے کے اس ابتدائی زمانے کو ایک 'غیر مشروط انجذاب' کے دور سے تعبیر کرتا ہے ۔یہ وہی دور ہوتا ہے جب استعمار کے وضع کردہ کلاسیے مقامی باشندوں اور تخلیق کاروں کے لیے ایک مثالی حیثیت کے حامل ہوتے ہیں۔انیسویں صدی کے اواخر میں ہونے والے مغربی نظم کے تراجم پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالی جائے تو یہ بات واضح ہو کر سامنے آتی ہے کہ مذکورہ عہد میں ترجمہ ہونے والی بیشتر نظموں کا متن اپنی عصری صورتِ حال کو سامنے لانے کی بجائے محض رومانوی تجربوں کی بازیافت پر اصرار کر رہا تھا۔فینن کے الفاظ دیکھیے:

> ''پہلے دور میں مقامی دانشور اس امر کا ثبوت دیتا ہے کہ اُس نے قابض قوت کی تہذیب کو اپنے اندر سمو لیا ہے۔اُس کی تحریریں نقطہ بہ نقطہ قابض ملک کے ادیبوں کی تحریروں کے مطابق ہوتی ہیں۔اُس کا تخلیقی محرک یورپ ہے اور ہم اُس کی تحریروں کو بہ آسانی قابض ملک کے مخصوص رجحانات سے منسلک کر سکتے ہیں۔''(۵)

جواہرِ منظوم، گوہرِ شب تاب اور اُس عہد میں شائع ہونے والے منظوم تراجم کے اور بہت سے مجموعوں کا جائزے سے یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ انیسویں صدی کے اواخر میں ایسے مغربی شاعروں کے انگریزی متون کو اُردو ترجمے کے لیے منتخب کیا گیا، جو اپنی شاعری میں یورپی استعمار کی مکمل حمایت کرتے تھے ۔مثال کے طور پر مشہور رومانوی شاعر ولیم ورڈزورتھ (William Wordsworth)، جسے نوآبادیاتی عہد میں بہت زیادہ قبولِ عام حاصل ہوا، اپنی نظموں میں کھل کر برطانوی سامراج کی حمایت کرتا ہے ،اُس کی بہت سی مشہور نظموں مثلاً Excursion اور Recluse کا مرکوز مطالعہ شعری متن میں چھپی اُن نوآبادیاتی پیچیدگیوں کو واضح کرتا ہے، جن کی وجہ سے نوآبادیاتی عہد میں مقامی باشندوں کے لیے مغربی نظم اور اس کے تراجم کو فروغ دیا جاتا ہے ۔ورڈزورتھ کی طرح کولرج (S.T Coleridge) بھی اپنی نظموں اور مضامین میں عظیم برطانیہ کی توسیع پسندانہ روش اور نوآبادیاتی اجارے کو محکوم ممالک کے لیےُ خدا کے انعام' ہی سے تعبیر کرتا ہے ۔مارلن ۔بی ۔روز نوآبادیاتی عہد میں رومانوی ادیبوں کے کردار کا تعین کرتے ہوئے لکھتا ہے:

> ''رومانوی ادیبوں نے برطانیہ کو حقیقی معنوں میں اپنی سامراجی منزل تک پہنچنے کے لیے تیار کیا۔اُنھوں نے انگریزی زبان سکھانے کے بہانے بتایا کہ 'میں' کے تجربے کو کس طرح

عالمگیریت میں تبدیل کیا جا سکتا ہے۔"(۶)

مارلن ۔بی۔روز نو آبادیاتی عہد میں رومانیت اور استعماریت کی ہم رشتگی کو ایک نئے تناظر میں سامنے لا رہا ہے۔مذکورہ عہد کے رومانوی ادب کا مطالعہ کرتے ہوئے اُس یورپی انانیت کو با آسانی نشان زد کیا جا سکتا ہے، جس نے استعمار کاروں اور استعمار زدہ باشندوں کے درمیان 'ہم' اور 'وہ' کی خلیج کو گہرا کرنے میں اہم کردار ادا کیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ یورپی اقوام نے اپنے نو آبادیاتی اجارے کی راہ ہموار کرنے کے لیے خود کو ایک ایسے نجات دہندہ کے طور پر پیش کیا تھا، جو مقامی باشندوں کو علمی ، ادبی ، تہذیبی اور ثقافتی سطح پر مہذب بنانے کا پورا منصوبہ ہمراہ لائے تھے۔اِس منصوبے کی آڑ میں جن شاعروں کی شاعری کو ایک رول ماڈل بنا کر مقامی سطح پر رواج دینے کی کوششیں کی جا رہی تھیں، وہ فکری اعتبار سے پوری طرح مغربی استعمار کے شانہ بشانہ کھڑے تھے اور اُن کی تحریریں قارئین کو متاثر کر رہی تھیں۔مثال کے طور پر ولیم ورڈز ورتھ کی ایک نظم کے چند مصرعے ملاحظہ ہوں :

So the wide waters,open to the power
The,will,the instincts,and appointed needs
of Britian,do invite her to cast off
Her swarms,and in succession send them forth;
Bound to establish new Communities
On every shorewhose aspect favours hope
Of bold adventure...
Earth's universal frame shall feel the effect;
Even the smallest habitable rock,
Beaten by the lonely billow's,hear the songs
Of humanised society ...
Your Country must complete
Her glorious destiny,Begin Even now (7)

درج بالا نظم کا متکلم اس بات کا پورا یقین رکھتا ہے کہ دنیا کی تمام اقوام برطانیہ کو ایک نجات دہندہ کے طور پر دیکھتی ہیں۔کسی معاشرے یا سماج کو غیر انسانی قرار دینا اور پھر اُسے انسانی بنا کر ایک عظیم الشان منزل تک پہنچانے کا ارادہ کرنا،مغربی استعمار کے پورے نو آبادیاتی منصوبے کو طشت از بام کر رہا ہے۔انیسویں صدی کے اواخر میں نو آبادیاتی ہندوستان میں پیدا ہونے والا مشہور برطانوی شاعر رُڈیارڈ کپلنگ (Rudyard Kipling) اپنی مشہورِ زمانہ نظم The White Man's Burden میں، ورڈز ورتھ کے خیالات سے بھی ایک قدم آگے بڑھ جاتا ہے اور' مقامی استعمار زدہ باشندوں' کو 'سفید آدمی' کے بوجھ سے تعبیر کرتا ہے۔کپلنگ کے خیال میں 'نو آبادیاتی باشندوں' کو جو' آدھے شیطان' اور' آدھے بچے' ہوتے ہیں مہذب اور مفید شہری بنانے کی ذمہ داری مغربی اقوام پر عائد ہوتی

ہے۔یہ وہی استعماری فکر ہے جس کے تحت محکوم ممالک کی اصلاح کی آڑ میں اُن کا معاشی استحصال کیا جاتا تھا۔یورپی اقوام کے سامراجی عزائم کو جواز مہیا کرنے کے لیے مغربی ادیب اور شاعر پیش پیش رہے اور اُن کی تحریریں نوآبادیاتی ایجنڈے کی توثیق کے لیے استعمار زدہ مقامی باشندوں کو'آدمی' اور'جانور' کی درمیانی صورت کے طور پر پیش کرتی رہیں۔ ورڈز ورتھ، کالرج سے لے کر کپلنگ تک نوآبادیاتی عہد میں مغرب کے ایسے سینکڑوں شاعروں کی نظموں کا سراغ ملتا ہے جنھوں نے اپنے شعری متون کے ذریعے مغربی استعمار کے ہر غلط قدم کو صحیح ثابت کرنے کی کوشش کی ۔انیسویں صدی کے اواخر میں برصغیر میں پروان چڑھنے والے نوآبادیاتی کلامیے کو سمجھنے کے بعد یہ بات واضح ہوکر سامنے آتی ہے کہ مغربی نظم کے فروغ کے پیچھے ایک منضبط اور مربوط نوآبادیاتی فکر کارفرما تھی ۔مذکورہ عہد میں جن مغربی شاعروں کی شعریات کو مقامی تخلیق کاروں کے سامنے ایک ماڈل کی حیثیت سے پیش کیا جارہا تھا اُن کی تحریریں پوری طرح نوآبادیاتی ایجنڈے اور آئیڈیالوجی کی حمایت کرتی تھیں ۔انھی معروضات کی روشنی میں رُڈیارڈ کپلنگ کی محولہ بالا نظم کا ایک بند ملاحظہ فرمایئے :

Take up the White Man’s burden
Send forth the best ye breed
Go send your sons to exile
To serve your captives' need
To wait in heavy harness
On fluttered folk and wild
Your new-caught, sullen peoples,
Half devil and half child
Take up the White Man’s burden (8)

انگریزی تراجم کے ابتدائی دور میں جواہرِ منظوم، گوہرِ شب تاب اور دیگر منظوم تراجم کے مجموعوں میں مغربی رومانوی شاعروں کے ایسے متن قاری کے سامنے پیش کیے جاتے ہیں جو عصری صورتِ حال پر کسی قسم کا کوئی سوال نہیں اٹھاتے۔اسی طرح مذکورہ عہد میں انفرادی سطح پر بھی جن لوگوں نے انگریزی نظم کے تراجم کیے،اُن میں متن کا انتخاب کرتے ہوئے رومانویت کو ہی پیشِ نظر رکھا۔اگر بہ نظرِ غائر دیکھا جائے تو انجمنِ پنجاب کے نظمیہ مشاعروں میں جدید شاعری کا جو ماڈل متعارف کروایا گیا تھا،انیسویں صدی کے آخری ربع میں انگریزی تراجم کا آغاز اُسے قبولِ عام دلانے ہی کی ایک عملی کوشش تھی۔ ڈاکٹر حنیف کیفی بھی مذکورہ عہد میں انگریزی شعر و ادب کی اِس درجہ پذیرائی کو انجمنِ پنجاب کے وضع کردہ شعری بیانیے سے منسلک کرتے ہیں۔اُن کے الفاظ میں:

''اُردو ادب میں مغربی ادب سے شعوری استفادے کا فراخ دلانہ رجحان محمد حسین آزاد کی جدید شاعری کی تحریک کے ساتھ داخل ہوتا ہے۔یہیں سے اردو میں انگریزی شعروادب کے اثرات کا آغاز ہوتا ہے اور اپنی تاریخ میں پہلی مرتبہ اردو شاعری ایک انقلابی فضا سے آشنا ہوتی

ہے۔‘‘(۹)

مذکورہ عہد کی یہ انقلابی فضا اُس نو آبادیاتی صورتِ حال کا زائیدہ تھی جس نے نظم نگاروں کو استعمار کاروں کے تخلیقی و تہذیبی سانچوں میں ڈھلنے پر مجبور کر دیا تھا۔ اُس زمانے کے اہم نظم نگاروں الطاف حسین حالؔی، مولانا حسین آزادؔ ،اکبرؔ الہ آبادی اور اسماعیلؔ میرٹھی کے ہاں جہاں مغربی نظم سے اخذ و تراجم کا واضح رجحان ملتا ہے وہیں ،قلق میرٹھی ،بانکے لال بہاری اور رحیم اللہ کے انگریزی تراجم کے مجموعے بھی یکے بعد دیگرے منصۂ شہود پر آتے ہیں۔انیسویں صدی کے اواخر میں مولانا عبدالحلیم شرؔر کے زیر ادارت شائع ہونے والے دلگداز نے انگریزی شاعری کے اردو تراجم کے فروغ میں انتہائی اہم کردار ادا کیا۔عبدالحلیم شرؔر نے ۱۹۰۰ء میں ایک انگریزی ڈرامے کا منظوم ترجمہ کیا جسے اردو میں ’نظمِ غیر مقفی کے ابتدائی نمونوں میں شمار کیا جا تا ہے ، بعد ازاں مولوی عبدالحق کے مشورے پر شرؔر نے ’نظمِ غیر مقفی کو’’نظم معرا‘ یا بلینک ورس (Blank Verse) کا نام دیا،جس نے آگے چل کر اردو نظم کو ہیئتی سطح پر نئی تبدیلیوں سے آشنا کیا۔ دلگداز کے صفحات پر اُس زمانے میں شائع ہونے والے بیشتر تراجم پر شرؔر کے لکھے ہوئے تعارفی نوٹ، ترجمے کے لیے منتخب ہونے والے متن اور مترجم کے بارے میں خاصی معلومات بہم پہنچاتے تھے۔اگر یہ کہا جائے تو بے جانہ ہوگا کہ انیسویں صدی کے اواخر میں مغربی تراجم کے فروغ کا علم شرؔر کے ہاتھ میں نظر آتا ہے ۔اُن کے انگریزی ڈراموں کے منظوم تراجم سے ترجمہ نگاری کے فن میں ایک نئی جہت کا اضافہ ہوا اور بیسویں صدی کے اوائل تک، اُن کے تتبع میں نظموں کے علاوہ انگریزی ڈراموں کے کئی منظوم تراجم بھی منظر عام پر آئے۔ڈاکٹر خلیل الرحمٰن اعظمی کے بقول :

> ’’شرؔر کے منظوم ڈراموں سے متاثر ہو کر احمد حسن فرہاد نے ’راجہ بھوج‘ پر ایک منظوم ڈرامہ لکھا اور کلکتہ کے ایک نوجوان شاعر بدر الزماں نے طباطبائی کے’ گورِ غریباں‘ کی ٹکنیک میں ولیم کاپر کی نظم ’اسیرِ غربت‘ اور ورڈز ورتھ کی ’لوسی گرے‘ کا منظوم ترجمہ کیا۔شرؔر نے ’مظلوم ورجینیا‘ کے عنوان سے ایک اور منظوم ڈرامہ نظمِ معریٰ میں لکھا۔نظم میں شرؔر کا آخری کارنامہ ’اسیرئ بابل‘ ہے جو گولڈ اسمتھ کی تخلیق ہے ۔اس کے بارے میں شرؔر لکھتے ہیں۔’’ترجمہ ویسی ہی نظم میں ہے جیسی گولڈ اسمتھ نے لکھی ہے۔اصل ہی کی طرح شعر خوانی ہے۔ نغمے ہیں۔اسی نمونے کے بند ہیں ،اسی شان و ترتیب سے قافیہ ہے ۔خلاصہ یہ کہ فقط الفاظ تو اردو ہیں باقی ہر چیز انگریزی ہے‘‘(۱۰)

یہ طویل اقتباس یہاں نقل کرنے کا مقصد انگریزی تراجم کے پسِ پشت اُن نو آبادیاتی کلامیوں کو سامنے لانا ہے، جو استعمار زدہ باشندوں کو بہرصورت اپنی تہذیب سے مغلوب کرنا چاہتے ہیں ۔اقتباس میں شرؔر کا آخری جملہ **’الفاظ تو اردو ہیں باقی ہر چیز انگریزی ہے‘** اُسی بیانیے کا تسلسل ہے جسے انجمن پنجاب کے مشاعروں میں نیچرل شاعری کے نام پر متعارف کروایا گیا تھا۔ استعمار کاروں نے مغربی رومانیت کو پروان چڑھانے کے لیے جو کلامیے وضع کیے تھے، انیسویں صدی کے اواخر میں اُس کے ثمرات ظاہر ہونا شروع ہوگئے تھے ، یہی وجہ ہے کہ اُس زمانے میں شائع

ہونے والے انگریزی تراجم کا متن ہر قسم کے مزاحمتی رویوں سے عاری ہے ۔ترجمہ نگار، ترجمے کے لیے جس نظم کا انتخاب کرتے تھے اُس کے متن میں رومانیت ایک بنیادی مظہر کے طور پر اپنا ادراک کراتی تھی ۔یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ برِصغیر کی نوآبادیاتی صورتِ حال میں رومانوی عناصر کو مذکورہ عہد کی 'اے پس ٹیم' (Episteme) کا جُزوِ لاینفک بنا دیا گیا تھا ۔۱۹۰۱ء میں سر عبدالقادر نے جب رسالہ مخزن کا آغاز کیا تو دلگداز کے اوراق سے شروع ہونے والی، انگریزی نظم کے تراجم کی تحریک کو مزید تقویّت ملی ڈاکٹر حسن الدین احمد کے الفاظ میں:

> ''مخزن کا مقصد ہی انگریزی نظموں کے ترجموں کی اشاعت تھا پہلا شمارہ اپریل ۱۹۰۱ء کے دیباچے میں یہ نوٹ موجود ہے کہ''انگریزی نظموں کے نمونے پر طبع زاد نظمیں اور انگریزی نظموں کے با محاورہ ترجمے شائع کرنا تا کہ متقدمین کی تقلید کرنے والے جدید مذاق سے آگاہ ہوں۔''(۱۱)

بیسویں صدی کے آغاز میں جدید نظم میں جو فکری اور فنی تبدیلیاں رونما ہوئیں اُن میں سب سے زیادہ ہاتھ انگریزی نظم کے تراجم کا تھا ۔استعمار کاروں نے انجمنِ پنجاب کی نیچرل شاعری کی تحریک کے نام پر جو بیج بویا تھا وہ اب ایک ثمرور پودے میں تبدیل ہوگیا تھا ۔بیسویں صدی کے بالکل آغاز میں ضامن کنتوری نے ارمغانِ فرنگ کے نام سے انگریزی نظم کے تراجم کا مجموعہ شائع کیا، جبکہ ۱۹۲۲ء میں غلام محی الدین نے مذکورہ عہد کے بہت سے اہم تراجم کو دو آتشہ کے نام سے مرتب کر کے قارئین کے سامنے پیش کیا ۔نوآبادیاتی صورتِ حال میں مقامی تہذیب وثقافت جتنی تیزی سے انگریزی تہذیب کے ہاتھوں پسپا ہورہی تھی ،اتنی ہی سرعت سے مشرقی شعریات کی جگہ مغربی شعریات کو مل رہی تھی ۔مذکورہ عہد میں جتنے بھی اہم نظم نگار سامنے آئے، اُن سب کے ہاں مغربی شعریات سے انسلاک کا عمل براہ راست نوآبادیاتی صورتِ حال کا زائیدہ تھا ۔انجمن پنجاب کی تحریک کے بعد جدید نظم میں ہیئتی اور فکری سطح پر رُونما ہونے والی تمام تبدیلیاں مغربی نظم کے تراجم کے ہی زیرِ اثر پروان چڑھیں ۔اِس زمانے میں دلگداز اور مخزن کے صفحات پر جن اہم اردو نظم نگاروں کے انگریزی تراجم دکھائی دیتے ہیں اُن میں وحید الدین سلیم پانی پتی (۱۸۵۹ء ۔۱۹۲۸ء)، پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی دہلوی (۱۸۶۶ء ۔۱۹۵۴ء)، نادر علی خاں نادر کاکوروی (۱۸۶۷ء ۔۱۹۱۲ء) ظفر علی خان (۱۸۷۰ء ۔۱۹۵۶ء) سید محمد ضامن کنتوری (۱۸۷۶ء ۔۱۹۴۶ء) غلام بھیک نیرنگ (۱۸۷۶ء۔۱۹۴۶ء) ڈاکٹر سر محمد اقبال (۱۸۷۷ء۔۱۹۳۸ء) منشی مہاراج بہادر برقؔ (۱۸۸۴ء۔۱۹۳۶ء) نواب میر جعفر علی خاں اثر لکھنوی (۱۸۸۵ء ۔۱۹۶۷ء) تلوک چند محروم (۱۸۸۷ء ۔۱۹۶۶ء)، حفیظ جالندھری (۱۹۰۰ء۔۱۹۸۲ء) کے نام زیادہ قابلِ ذکر ہیں ۔ڈاکٹر حنیف کیفی کے الفاظ میں:

> ''پرانے رسائل کی ورق گردانی سے پتہ چلتا ہے کہ انیسویں صدی کے اواخر سے بیسویں صدی کے ابتدائی چند برسوں تک منظوم ترجموں کا چلن خاصا زور پکڑ چکا تھا، یہاں تک کہ ضامنؔ کنتوری کے منظوم ترجموں کا ایک پورا مجموعہ 'ارمغانِ فرنگ' کے نام سے بیسیویں صدی کے بالکل شروع میں منظر عام پر آ گیا تھا۔'' (۱۲)

انیسویں صدی کے اواخر اور بیسیویں صدی کے آغاز میں درج بالا تمام نظم نگاروں نے اردو تراجم کے لیے جن انگریزی نظموں کے متن کا انتخاب کیا اُن میں سے بعض رومانوی نظموں کی مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ ایک نظم کہ کئی کئی ترجمے مختلف رسائل کے اوراق کی زینت بنتے تھے۔مثلا تھامس گرے (Thomas Grey) کی نظم ایلجی (Elegy) کو حید رطبا طبائی کے علاوہ سیّد احمد کبیر اور امیر چند بہار ٹیک نے بھی اردو کے قالب میں ڈھالا۔اسی طرح لارڈ لٹن (Edward George Bulwer-Lytton) جو تاجِ برطانیہ کی طرف سے برطانوی نو آبادیات کے سیکرٹری آف سٹیٹ(Secretary of State) تھے کی ایک نظم 'اندھی پھول بیچنے والی کا گیت'(The Blind Flower-Girl's Song) کومولانا محمد حسین آزاد کے علاوہ سرور جہاں آبادی،سیّد محمد ابراہیم اشک ،اشک بلندشہری اور احسن لکھنوی نے بھی اردو میں ترجمہ کیا۔مذکورہ عہد میں نو آبادیاتی کلامیوں کے زیر اثر جس رومانوی متن کو دھڑا دھڑ اُردو کے قالب میں منتقل کیا جارہا تھا اُس پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالنے کے لیے مذکورہ دونوں نظموں کے تراجم کے کچھ حصے ملاحظہ ہوں:

جو آیا ہے جہاں میں یاں سے جانا ہے اُسے اک دن
یہ ہونا ہے کوئی چاہے گا دل سے یا نہ چاہے گا
مگر جاتے ہوئے پھر کر نہ دیکھے یہ نہیں ممکن
دلوں سے یاد بھی مٹ جائے یہ حاشا نہ چاہے گا

کوئی زانو کسی کا ڈھونڈتا ہے دم نکلنے کو
کہ دیکھے اشک گرتے چاہنے والے کے دامن میں
کسی کی ہے یہ خواہش دوست کاندھا دیں جنازے کو
پھر اُس پہ فاتحہ کی آرزو ہے کنجِ مدفن میں

حقیقت غور سے دیکھیں جو ان سب مرنے والوں کی
تو ایسا ہی نظر آئے گا انجامِ کار اپنا
انھیں کی طرح جیسے مل گئے ہیں خاک میں ہم بھی
یونہی پرسانِ حال آنکلا ہے اک دوست دار اپنا

نظم: گورِ غریباں (۱۳)
(مترجم: نظم حیدر طباطبائی)

لوگو! میرے پھول خریدو
کہتی ہیں کیا یہ جانیں سنو تو

اِن کو بھی دی ہے زباں اللہ نے
تا کہ کریں یہ فریاد تم سے
اس لڑکی کا سانس ہماری
مُرجھا دے گا پنکھڑیاں ساری
ہم نازک ہیں پُھول حسیں ہیں
نور کے بچے ، چشمِ زمیں ہیں
تاریکی میں رہنے والی
لڑکی سے ہے جاں گھبراتی
نابینا کے قید سے ہم کو
کیجیے آزاد اب اے لوگو
بے نُور اس کی آنکھیں ستم ہیں
عاشق دیکھنے والے کے ہم ہیں
تاریکی میں حُسن ہمارا
دیکھیے اب تک کس نے دیکھا۔

نظم: نابینا پُھول والی کا گیت (۱۴)

(مترجم: محمد حسین آزاد)

دونوں نظموں کا بیانیہ متن سپاٹ اور اکہرا ہونے کے باعث اُس استعاراتی قوت سے یکسر محروم ہے جو شعری متن کو کثیر جہات کا حامل بناتی ہے۔ دونوں نظموں میں بیانیے کے تفاعل کے ذریعے دو مختلف واقعات کو متن کی ساخت میں منقلب کیا گیا ہے اور یہ واقعات نظموں کے متکلمین کی رومانوی شناخت کا تعین کر رہے ہیں۔ مذکورہ عہد میں انگریزی تراجم کے ذریعے، متن کے جس یک رُخے تصور کو پروان چڑھایا جا رہا تھا درج بالا نظموں کے ٹکڑے اُس تصور کے بنیادی خدو خال واضح کرتے ہیں۔ یہ وہی شاعری ہے جسے پہلے انجمنِ پنجاب کی نیچرل شاعری کی تحریک کے نام پر متعارف کروایا گیا اور پھر مغربی نظم کے تراجم کے ذریعے فروغ دیا گیا۔ اس شاعری کے زیر اثر تخلیق کار وں نے باہر کی دنیا سے ربط ضبط گھٹا کر اپنی توجہ حقائق کی بجائے تخیل اور ادراکات کی بجائے رومانی نظریۂ زندگی پر مبذول کیے رکھی۔ ٹامس کیمبل (Thomas Campbell) کا ایک مشہور مصرع ہے کہ 'فاصلہ نظارے کو ایک طلسمی کیفیت بخش دیتا ہے'، مذکورہ عہد میں رومانیت کے زیر اثر تشکیل دیا گیا شعری کلامیہ بھی مقامی باشندوں کی توجہ نو آبادیاتی جبر و استبداد سے ہٹا کر ایک ایسی سمت کی طرف پھیر رہا تھا، جس میں یورپ فاصلے پر ہونے کے باعث بے انتہا کشش کا باعث تھا۔ اس تمام صورتِ حال کے سیّاق میں روز تھروپ (Rose Harturick Thrope) کی نظم Curfew Must Not Ring Tonight کا نادر کاکوروی کیا ہوا ترجمہ دیکھیے جس

میں یورپی حکمرانوں کو اپنی رعایا کے لیے حد درجہ مہربان دکھایا گیا ہے۔نظم نگار نے مذکورہ نظم میں ایک رومانوی داستان بیان کی ہے جس میں ایک بیوی اپنے شوہر کو پھانسی سے بچانے لیے، پھانسی کے مقررہ وقت پر شہر کا گھنٹا بجنے سے روک لیتی ہے۔اِس موقع پر 'سرتاجِ انگلستاں' کرامویل(Cromwell) ایک رحم دل اور محبت پرست بادشاہ کے روپ میں سامنے آکر تمام ماجرا سنتا ہے اور پھر اُس کے شوہر کی سزا معاف کردیتا ہے۔نظم کے آخری اشعار ملاحظہ فرمایئے:

دور ایک ٹیکرے پر آکر ہوا نمایاں
جمہوریت کا بانی سرتاج انگلستاں
اور لگ گئیں نگاہیں سب کی کرامول پر
کیا حکم دیں وہ دیکھیں گھنٹے کے اس خلل پر
اک بار ہاتھ اس نے خاموشی سے اٹھایا
اور لفظ ''بس'' کا لب پر وہ حاکمانہ لایا
گھڑیالی رسہ رکھ کر ہٹ آیا گھنٹہ گھر سے
جسمِ معلق اترا چپکے منار پر سے
اور گرتی پڑتی پہنچی خوش خوش وہ اس جبل پر
جاتے ہی گر پڑی وہ پائے کرامول پر
سب سرگذشت اپنی رو رو کے کہہ سنائی
گھڑیالی کی خوشامد، مینار کی چڑھائی
لٹکن کو پکڑے گھنٹے کے بیچ میں لٹکنا
آواز کی طرح سے گنبد میں سر پٹکنا
وہ انگلیاں دکھائیں جو رسے کی رگڑ سے
چھل چھل گئی تھیں بالکل کٹ کٹ گئی تھیں جڑ سے
جو چومنے کے لائق پیاری ہتھیلیاں تھیں
وہ آہ گہرے گہرے زخموں سے خونچکاں تھیں
دیکھا کرامول نے یہ حالِ زار اس کا
اور رحم نے کیا دل بے اختیار اس کا
بولا کہ جرم ثابت ہے گو ضرور اس کا
لیکن معاف کرتے ہیں ہم قصور اس کا

جا نیک بخت ،شوہر زندہ ترا رہے گا
اور آج گھنٹی گھر کا گھنٹہ نہیں بجے گا

نظم: گھنٹہ نہیں بجے گا(۱۵)
(مترجم : نادر کاکوروی)

یہ نظم مقامی باشندوں کے دل میں اپنے نئے حکمرانوں کے لیے محبت اور احترام کے جذبات پیدا کرنے کی بالواسطہ کوشش ہے۔ مذکورہ عہد کے انگریزی نظم کے تراجم میں اول تو کسی سیاسی اور قومی کش مکش کے مدھم سے نقوش بھی نہیں ملتے ،لیکن اگر کہیں کوئی اِکا دُکا مغربی کردار نظر آ بھی جائے تو اُسے ہمدردی اور انسانیت کا پیکر بنا کر پیش کیا جاتا ہے ۔انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے آغاز میں ہونے والے انگریزی نظم کے تراجم کا مطالعہ اس بات پر دال ہے کہ جدید اردو نظم کے اِس تشکیلی اور عبوری دور میں ان تراجم نے فکری ،فنی اور ہیئتی سطح پر جدید نظم کو نئے رویوں سے آشنا کیا۔مغربی استعمار کاروں نے انجمنِ پنجاب کے نظمیہ مشاعروں کے ذریعے مقامی شعریات میں جس تبدیلی کا اعلان کیا تھا انیسویں صدی کے اواخر تک اُس کے خدوخال واضح ہونا شروع ہو گئے تھے ۔ان تراجم کے ذریعے پروان چڑھنے والی رومانیت نے آگے چل کر جہاں اقبالؔ جیسی توانا آواز کو جدید نظم کے قافلے کا سالار بنایا وہیں حقیقت نگاری / واقعیت پسندی پر کامل ارتکاز نے اودھ پنچ جیسے مزاحمتی روّیوں کو بھی فروغ دیا ،جنھوں نے آگے چل کر استعماری بیانیوں کے مقابل بیانیے (Counter Narrative) کا کردار ادا کیا۔

حوالہ جات وحواشی:

(۱) حسن الدین احمد، ڈاکٹر، انگریزی شاعری کے منظوم اُردو ترجموں کا تحقیقی و تنقیدی مطالعہ، حیدرآباد: ولا اکیڈمی ،مئی ۱۹۸۴ء ،ص۱۱۲۔

(۲) جمیل جالبی ،ڈاکٹر ،تاریخِ ادبِ اردو، جلد چہارم،مجلسِ ترقی ادب ،لاہور،فروری ۲۰۱۲ء ،ص۴۸۲۔

(3) Tejasvani Niranjana A, Translation,Colonialism and the Rise of English, inc ***Rethinking English Essays in Literature, Language History*** (Edited by Svati Joshi),Delhi:Oxford University Press,1994,p32.

تے جسوانی نرینجانا کے اصل الفاظ یہ ہیں:

The demand for English education on the part of the colonized is clearly not a simple recognition of 'backwardness' or mere political expedience, but a complex need arising from the

braiding of a host of historical factors, a need produced and sustained by colonial translation.

(۴) لے سیلے، ابر کرومبی (Lascelles Abercrombie) 'رومانیت' مشمولہ مغربی شعریات (مترجم و مرتب: ہادی حسین) لاہور: مجلس ترقیِ ادب، ۱۹۶۷ء، ۳۰۵۔

(۵) فرانز فینن، افتادگانِ خاک (مترجم: محمد پرویز، سجاد باقر رضوی)، لاہور: نگارشات، مارچ ۱۹۶۹ء، ص۱۹۲۔

(6) Marlon B,Ross, ***Romantic Quest and Conquest, In Romanticism and Feminism***, ed. Anne K.Mellor,Bloomington,1988,P.31

مارلن ۔بی ۔روز کے الفاظ دیکھیے:

In the very real sense the Romantics help prepare England for its Imperial destiny ,they help teach the English to universalise the experience of 'I'.

(7) William Wordsworth ***The Poetical Work of William Wordsworth,*** Vol.5, (Edited by Helen Darbishire), Oxford: 1972, p295-299.

(8) Rudyard Kipling, ***Rudyard Kipling's Verse*** (Definitive Edition), Garden, City,New York:Doubleday,1929,p321.

(۹) حنیف کیفی، ڈاکٹر، اردو میں نظمِ معریٰ اور آزاد نظم، لاہور: الوقار پبلی کیشنز، ۱۹۹۵ء ص۱۹۔

(۱۰) خلیل الرحمٰن اعظمی، ڈاکٹر، ''اردو نظم کا نیا رنگ و آہنگ: تشکیلی دور (۱۹۱۴ء۔۱۹۳۶ء)'' مشمولہ سوغات، (جدید نظم نمبر)، بنگلور، ص۹۲۔

(۱۱) سازِ مغرب (حصہ دوم)، مرتبہ حسن الدین احمد، حیدر آباد: ولا اکیڈمی، اپریل ۱۹۷۷ء، ص۲۹۔۳۰۔

(۱۲) حنیف کیفی، ڈاکٹر، اردو میں نظمِ معریٰ اور آزاد نظم، ص۶۵۔

(۱۳) سازِ مغرب (حصہ اول)، حیدر آباد: ولا اکیڈمی، ستمبر ۱۹۷۶ء، ص۱۷۔

(۱۴) سازِ مغرب (حصہ دوم)، مرتبہ حسن الدین احمد، ص۴۶۔

(۱۵) سازِ مغرب، جلد اول، مرتبہ حسن الدین احمد، ص۱۰۳۔۱۰۴۔